جی چاہتا ہے نقشِ قدم چومتے چلیں

عبدالماجد دریابادیؒ

خان یاسر

امی، ابّی اور دادا کے نام

جن سے میں نے سیکھا کہ
عظیم شخصیات
آسمان سے نہیں اترتیں
بلکہ
زمین پر پیدا ہوتی ہیں،
زمین سے وابستہ ہوتی ہیں؛
اور یہ کہ
ہر بچہ
اگر 'چاہے'
تو 'بڑا' آدمی بن سکتا ہے...

اے پرستارانِ نغمہ چھوڑ کر تارِ رباب
آج کچھ دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھتا ہوں میں

”طبعی تقاضوں کی تکمیل کی جاسکتی ہے لیکن ہوس کی آگ بجھانے کے لیے کوئی حد و نہایت نہیں؛ ہوس رانی جتنی بھی کیجیے گا، طبیعت بجائے آسودہ ہوجانے کے حریص سے حریص تر ہوتی جائے گی، آگ بجھنے کے بجائے بھڑکتی ہی جائے گی، ضرر وزیاں صریح واقع ہوتا جائے گا، لیکن طبیعت کو اس کا احساس ہی سرے سے جاتا رہے گا۔ نفس امارہ بڑا منطقی، بڑا فقیہ واقع ہوا ہے؛ ہر نفس پرستی، ہر ہوسناکی اور اس سے پیدا ہونے والے ضرر وزیاں کی کوئی نہ کوئی خوبصورت تاویل و توجیہ ہر بار کرے گا اور ہل من مزید کے نعرے لگاتا ہوا آپ کو برابر مغالطہ اور دھوکے میں الجھائے رکھے گا! لازم ہے کہ ہر خواہش نفس پر حاکم طبیعت کو نہیں، عقل کو رکھیے اور عقل کی حاکمیت کا نفاذ بڑی سختی سے کرتے رہیے۔ ہیجان نفس کے وقت (عام اس سے کہ وہ ہیجان غصہ کا ہو، حب جاہ کا ہو، حرص مال کا ہو، شہوت جنسی کا ہو) عقل تک اندھی اور مغلوب ہوجاتی ہے! ایسے موقع پر دستگیری شریعت سے پائیے، اور پناہ احکام خداوندی میں ڈھونڈیے، نفس کو بے لگام کسی حال میں بھی نہ ہونے دیجیے، اس شورہ پشت گھوڑے سے آپ ذرا بھی غافل ہوئے اور اس نے آپ کو زمین پر دے پٹکا! غصہ اور شہوانیت، یہ نفس کے دو بے پناہ حربے ہیں، اور انسانیت کے دشمن قاتل! اگر ان پر نوعمری میں ہی قابو پالیا گیا، انھیں عقل اور اس سے بڑھ کر شریعت کے تحت میں لے آیا گیا، جب تو خیر ہے، ورنہ اگر یہ سنپولیے بڑھ کر اژدہے ہوگئے تو کوئی صورت ان سے نجات پانے کی نہ رہے گی۔ سن کے ساتھ ساتھ ان کی گرفت بھی سخت سے سخت تر ہوتی جائے گی، انسان خمیازہ اٹھائے گا، پچھتائے گا، جھنجلائے گا، پھر بھی بس پھڑ پھڑا کر رہ جائے گا، ان کے پنجے سے رہائی کی کوئی صورت آسان نہ ہوگی![16]“

(عبدالماجد دریابادی)

عبدالماجد دریابادی

سہانا بچپن: عبدالماجد 16 مارچ 1892 کو قصبہ دریاباد، ضلع بارہ بنکی (یوپی) میں پیدا ہوئے۔ آپ ایک خوشحال اور تعلیم یافتہ گھرانے کے چشم و چراغ تھے، والد ڈپٹی کلکٹر تھے جو یوپی کے متعدد ضلعوں میں خدمات انجام دینے کے بعد 1904 میں ریٹائر ہوئے۔ تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر نظم ہوا۔ عمر کے چوتھے سال، قابل اساتذہ کی نگرانی میں، گھر ہی پر ان کی باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ قرآن مجید ناظرہ، اردو، فارسی، عربی کی مروجہ تعلیم پائی۔ ابھی چار پانچ سال ہی کے تھے کہ نماز پنجگانہ کی عادت ڈال لی۔ اپنے والد کے ساتھ آپ دینی اجتماعات میں شرکت کرتے بالخصوص ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں ضرور شریک ہوتے، یہیں سب سے پہلے علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی سے ملاقات ہوئی۔

والد کا تبادلہ جب سیتا پور ہو گیا تو آپ بھی سیتا پور آ گئے۔ 1901 میں سیتا پور کے اسکول میں داخل ہوئے۔ بچپن سے طبیعت غور و فکر کرنے والی پائی تھی چنانچہ اسکول گئے تو وہاں پہلی بار غیر مذہب والوں خصوصاً ہندوؤں کا مشاہدہ کیا، گندی زبان، فحش کلامی اور گالم گلوچ کرتے سنا۔ بچوں کو ایک دوسرے کے ساتھ چھوت چھات کرتے دیکھا۔ گھر کی تربیت کی وجہ سے آپ نے نہ صرف یہ کہ اپنی جماعت کے ساتھیوں سے گالم گلوچ، لڑائی جھگڑے اور فحش کلامی جیسی کوئی گندی عادت نہ سیکھی بلکہ اپنے اخلاق و کردار سے ساتھیوں اور اساتذہ پر ایک زبردست چھاپ چھوڑی۔ عبدالماجد ایک متوسط درجے کے طالب علم تھے جسے ریاضی سے خدا واسطے کا بیر تھا البتہ غیر درسی مطالعے میں آپ کا خوب من لگتا تھا۔ مطالعے کا یہ شوق جنون کی حدوں کو پہنچا ہوا تھا کتاب، رسالہ، اخبار، اشتہار... غرض لکھا ہوا جو کچھ نظروں کے سامنے آ جائے تو پھر اس کا بغیر پڑھے چھوڑنا محال تھا۔ اسکول سے گھر آنے کے بعد بھی اخبار پہلے پڑھتے، کھانا بعد میں کھاتے؛ کھاتے وقت بھی عموماً کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں ہوتی۔ آنکھ پر زور ڈالنے، اندھیرے میں پڑھنے اور اسی قسم کی دیگر بداحتیاطیوں کا نتیجہ تھا کہ پندرہ برس کی عمر میں ہی عینک لگ گئی۔

صرف پڑھنے کا نہیں بلکہ لکھنے کا شوق بھی بچپن سے پایا تھا۔ 1902 میں اسلام کے خلاف کسی کتاب پر نظر پڑی جس میں اللہ اور اس کے رسول کی شان میں گستاخی کی گئی تھی تو اس کا جواب لکھنے کے لیے بے چین ہو گئے۔ سات آٹھ برس کی عمر سے ہی عزیزوں اور رشتہ داروں کو لمبے چوڑے خطوط لکھنے لگے تھے۔ 1904 سے باقاعدہ مضمون نگاری شروع کی۔ شروع میں ایک طرح کی جھجک تھی لہذا مختلف قلمی ناموں سے لکھنا شروع کیا۔ بالعموم نیچریوں کے رد میں اودھ اخبار میں گمنام مضامین لکھے۔
ان مضامین کے خوب چرچے ہوئے، اصلاً ان مضامین کا لکھنے والا کون ہے یہ کسی کو پتہ نہ تھا۔ آپ نے خود اپنے والد کو کئی مرتبہ ان مضامین کی تعریف کرتے سنا اور دل ہی دل میں خوب خوش ہوئے۔ اس کامیابی سے آپ کی جھجک دور ہوئی اور 1908 میں وکیل (امرتسر) کے لیے محمود غزنوی اور غذائے انسانی کے موضوع پر دو مضمون لکھے۔ ان مضامین کی دھوم مچ گئی، بعد میں یہ مضامین الگ سے رسالے کی شکل میں بھی چھاپے گئے۔

اسکول کے ذہین اور اساتذہ کے چہیتے طلبہ میں آپ کا شمار ہوتا تھا۔ چھٹے درجے سے ہی کلاس کے مانیٹر بھی ہو گئے تھے۔ بڑوں کی صحبت خصوصاً علمی صحبت انھیں خوب راس آتی تھی چنانچہ ابھی ساتویں جماعت میں ہی تھے کہ فرینڈز کلب میں حصہ لینا شروع کیا جہاں مختلف موضوعات پر علمی مقالے پڑھے جاتے تھے، مباحث ہوتے تھے، اور اخبار و رسائل منگائے جاتے تھے۔ اسکول میں جو لڑکے نماز پڑھتے تھے وہ جمعہ کے دن جامع مسجد جانا چاہتے تھے لیکن اس پر اسکول میں آدھے دن کی غیر حاضری لگائی جاتی تھی۔ عبدالماجد نے نمازی لڑکوں کو ساتھ لے کر ایک تحریک چلائی اور انگریزی میں ایک بڑا سا میمورنڈم لکھ کر پرنسپل صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ یہ احتجاج کامیاب رہا۔

کھیلوں میں بھی آپ حصہ لیتے اور دوڑ کا مقابلہ، رسہ کشی، کرکٹ، ٹینس جیسے کھیلوں سے شغف رہا؛ فٹ بال تو خوب شوق سے کھیلتے تھے۔ 1908 میں آپ نے میٹرک پاس کرلیا۔

شکوک کی فصل، الحاد کی کھیتی: میٹرک کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ نے کیننگ کالج (لکھنؤ) میں داخلہ لے لیا۔ یہاں کالج کے اور دیگر کتب خانوں کی موجودگی کی وجہ سے ان کی بن آئی، اور آپ کے وقت کا بڑا حصہ مطالعہ میں گزرنے لگا۔ آپ کالج کی علمی مجالس میں بھی شریک رہے۔ آپ تقریریں کرنے سے ضرور شرماتے تھے لیکن تحریری مقالے پیش کرنے کا شوق تھا۔ جان اسٹورٹ مل پر ایک طویل مقالہ لکھنے پر آپ کو اول انعام سے بھی نوازا گیا۔ بعد ازاں آپ

نے کالج میں ایک علمی مجلس بنائی اور اس کی صدارت کے فرائض انجام دیے۔ اس مجلس میں ہر ہفتے کسی نہ کسی فلسفیانہ موضوع پر کوئی نہ کوئی تحریری مقالہ پڑھا جاتا، پھر اس پر مذاکرہ ہوتا۔ بی اے میں آپ کا ایک مضمون عربی بھی تھا، آپ نے اپنے دوست سے عربی سیکھی اور انھیں انگریزی سکھائی۔

اس زمانے میں آپ کا زیادہ تر وقت فلسفہ اور نفسیات کے موضوع پر مغربی کتب کے مطالعے میں گزرتا۔ آپ کا مطالعہ گو کمیت کے اعتبار سے خوب تھا لیکن اس کی کوئی سمت متعین نہ تھی، اس میں گہرائی اور گیرائی نہیں تھی خصوصاً اسلام کا مطالعہ صرف روایتی قسم کی چند کتابوں پر مشتمل تھا جو جدید ذہن کو اپیل کرنے کی قابلیت نہ رکھتی تھیں۔ اس کے مقابلے میں علوم جدیدہ کا آپ نے کافی گہرا مطالعہ کر رکھا تھا، خصوصاً فلسفہ کے میدان کے شہسوار تھے۔ اسلام کا یہ روایتی مطالعہ مستشرقین کی علمی وفکری یلغار کے سامنے زیادہ دیر نہ ٹھیر سکا۔ فلسفہ کی کتابوں میں الحاد اور خدا کے انکار کو ایک بدیہی حقیقت کا درجہ حاصل تھا۔ مذہب کو دورِ سائنس سے پہلے کی فرسودہ باتوں میں سے ایک بات سمجھا جاتا تھا۔ اس علمی یلغار کا عبدالماجد کے ناپختہ ذہن نے خاطر خواہ اثر قبول کیا اور وہ دن بہ دن اسلام سے دور ہوتے چلے گئے۔ ستم بالائے ستم یہ کہ صحبت بھی چن کر ایسے عقل پرستوں اور 'روشن خیال' دوستوں کی میسر آئی کہ عقلیت و الحاد کا یہ نشہ دو آتشہ ہو گیا۔ نمازوں سے پہلے خشوع وخضوع رخصت ہوا، پھر سستی و کاہلی سے نمازیں چھوٹنے لگیں، آخر ان کے شب وروز سے نمازیں ہی رخصت ہو گئیں۔ روزہ، تلاوت... کسی چیز سے کوئی واسطہ نہ رہا۔ علمیت وعقلیت کا خمار اتنا بڑھا کہ ہر غیر علمی وغیر عقلی شئے جو علم وعقل کے لبادے میں پیش کر دی جاتی بلا تکلف اس پر ایمان لے آتے۔ چنانچہ کسی کتاب میں نعوذ باللہ آپؐ کی تصویر پر نظر پڑی، ہتھیاروں سے مرصع، چہرے سے نحوست ٹپکتی ہوئی، قبائلی سردار کی شکل میں جس طرح مصور نے آپؐ کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کی تھی اس نے عبدالماجد کے ذہن پر خاطر خواہ اثر کیا۔ ایک لمحے کے لیے آپ کو یہ خیال نہ گزرا کہ یہ تصویر جھوٹی بھی ہو سکتی ہے الٹا یہ ہوا کہ آپؐ کو خدا کا رسول ماننے میں تامل تو پہلے ہی سے تھا اب ایک عظیم مصلح وبزرگ ہستی ماننا بھی مشکل ہو گیا۔ وحی، ایک نفسیاتی عارضہ قرار پائی۔ اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اپنے آپ کو مسلمان کہنے سے بھی شرم آنے لگی۔ یہ وہ وقت تھا جب آپ پر مل، اسپنسر، ہکسلے کا بھوت سوار تھا۔ گھر بھر میں خشک مشہور تھے چنانچہ دسمبر 1913 میں آگرہ گئے اور تاج محل دیکھے بغیر لوٹ آئے۔

جب الحاد کا دور شروع ہوا تو مضامین بھی ملحدانہ اور نیشنلسٹ قسم کے ہو گئے اور ایک بار پھر گمنام لکھنے

لگے۔ 1910 میں علامہ شبلی کی الکلام پر سوا سو صفحے کی لمبی چوڑی تنقید کی اور اسلامی عقائد کو چن چن کر نشانہ بنایا۔ نیچر، مائینڈ اور اسی طرح ولایت کے دیگر سائنسی رسالے آپ باقاعدگی سے پڑھتے تھے۔ 1913 میں Nature میں نفسیات پر آپ کا ایک طویل مراسلہ چھپا اور اگلے نمبر میں پروفیسر میک ڈوگل نے اس کی تعریف کی اور اس کا جواب لکھا۔ اس زمانے میں فلسفہ پر آپ نے متعدد کتابیں اور مضامین لکھے۔ 1914 میں آپ کی کتاب **فلسفۂ جذبات** چھپی۔ نومبر 1915 میں سائیکولوجی آف لیڈرشپ لندن سے شائع ہوئی۔ 1916 میں اس کتاب کو متعدد اضافوں کے ساتھ فلسفۂ اجتماع کے نام سے اردو میں منتقل کیا۔

لیکن باوجود اپنی تمام عقلیت پرستی اور الحاد کے اسلام سے یک گونہ جذباتی تعلق اب بھی باقی تھا۔ 1911 میں جب پادری زویمر سے ملاقات ہوئی اور انھوں نے حسب عادت اسلام پر اعتراضات کرنے شروع کیے تو عبدالماجد نے خوب خوب جواب دیے۔ 1911 میں آل انڈیا طبی اینڈ ویدک کانفرنس منعقد ہوئی۔ یہاں آپ نے طب یونانی کی اہمیت اور افادیت پر ایک مضمون پڑھا۔ خوب واہ واہ ہوئی۔ 1910 میں برطانوی ہفتہ وار Saturday Review میں vegetarianism پر بحث چھڑی تو آپ نے گوشت خوری کی حمایت میں دو تین مراسلے لکھ بھیجے جو اہتمام سے شائع ہوئے۔ جون 1911 میں East and West میں گوشت خوری کی حمایت میں ایک مضمون لکھا۔ آپ میٹھے زہر سے الحاد کا شکار ہو گئے تھے ورنہ جان بوجھ کر جب کسی نے اسلام پر حملہ کیا آپ نے حتی المقدور اس کا دفاع کیا۔

جون 1912 میں بی اے کی تکمیل کی۔ نومبر 1912 میں حج کے سفر پر والد ماجد کا انتقال ہو گیا۔ ایم اے کے لیے علی گڑھ گئے اور بعد ازاں دہلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج گئے لیکن معاشی و خانگی مسائل کی وجہ یکسو نہ ہو سکے۔ آخر ایم اے کیے بغیر لکھنؤ لوٹ آئے۔

پھر سوئے حرم: آپ کے عزیز و اقارب، آپ کی دہریت سے خاصے پریشان تھے۔ خصوصاً والد صاحب ان کی اصلاح کے درپے رہتے تھے، ہر بڑے بزرگ سے ملواتے اور چاہتے تھے کہ کسی طرح ان کی اصلاح ہو، حج کے موقع پر خانہ کعبہ کا پردہ تھام کر رو رو کر اپنے بیٹے کی اصلاح کی دعائیں مانگی تھیں۔ اسی حج کے دوران انتقال فرمایا۔ اکبر الہ آبادی نے بھی وقتاً فوقتاً اپنی حکیمانہ تبلیغ سے اس بگڑے ہوئے نوجوان کی اصلاح کی خوب کوششیں کیں۔ ان کوششوں میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ

'ہدایت کے لیے نہیں' بلکہ 'عربی ادب سے واقفیت کے لیے' قرآن پڑھا جائے۔ مہدی حسن افادی، سید سلیمان ندوی وغیرہ نے بھی رفاقت کا حق ادا کیا۔

قدرت کا لطیفہ یہ ہوا کہ جس مطالعے کی بے راہروی سے آپ گمراہی کا شکار ہوئے تھے انہی بھول بھلیوں میں بھٹکتے بھٹکتے وہ حق کی شاہراہ پر جا نکلے۔ یہ تغیر اتنا دبے پاؤں ہوا کہ خود انھیں پتہ نہ چلا کہ کب وہ ملحد سے موحد بن گئے۔ فلسفہ کا مطالعہ کرتے کرتے آپ نے کنفیوشس کے خیالات کا مطالعہ کیا؛ اس کے بعد جین مت اور بدھ مت کے دنیا سے متعلق خیالات سے واقف ہوئے۔ ان خیالات نے گو ان کے دل کی دنیا نہیں بدلی لیکن انھوں نے سوچا کہ جس طرح مغربی علوم دنیا کی گتھی سلجھانے کا ایک طریقہ ہیں اسی طرح بے شمار عقائد اور دنیا کی تفسیریں موجود ہیں اور مغربی علوم اور الحاد ان تمام نظریات میں سے ایک نظریہ ہیں۔ تھیا سوفی لٹریچر، ہندو تصوف و فلسفہ اور گیتا کے مطالعے نے اس خیال کو تقویت پہنچائی کہ ہر فلسفہ کے پاس اپنے دلائل ہیں اور مغربی فلسفہ کوئی آسمان سے اتری ہوئی چیز نہیں۔ تلک، آروبندو گھوش، اینی بیسینٹ اور گاندھی کی تحریروں نے مغربی افکار کے سیاہ چہرے کو بے نقاب کرنے میں اہم کردار ادا کیا اور وہ انسانی زندگی میں اخلاقی قدروں کی اہمیت کے (کسی نہ کسی درجے میں) قائل ہو گئے۔

مغربی فلسفے کا اسلام پر سب سے فیصلہ کن وار رسالت محمدیؐ پر تھا۔ ایک رسالتِ محمدیؐ کی جڑ کاٹ دی جائے تو وحیٔ الٰہی، توحید، آخرت الغرض سارے اسلام کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ چنانچہ وحی کو نفسیاتی عارضہ قرار دینا، آپؐ کو نعوذ باللہ ایک مجنون اور قوم پرست لیڈر گرداننا وغیرہ اسی سازش کا حصہ تھا۔ لیکن جب عبدالماجد نے علامہ شبلیؒ کی سیرت النبی کی پہلی جلد کا مطالعہ کیا تو آپؐ کی ذات بابرکت پر مغرب کے سارے حملے دیوانے کی بڑ نظر آئے۔ آپؐ کی عظمت کے عبدالماجد دل و جان سے قائل ہو گئے۔ اسی طرح مولانا روم کی مثنوی نے آپ کے دل و دماغ کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان کے الحاد کے تابوت پر آخری کیل محمد علی لاہوری کا انگریزی ترجمۂ قرآن ثابت ہوا جسے پڑھنے کے بعد نورِ اسلام کی ضیاپاشیوں نے ان کے قلب کو منور کر دیا۔ اب آپ نے الحاد سے توبہ کی اور کلمۂ شہادت کی تجدید کر کے ایک طرح سے از سر نو اسلام لے آئے۔

عبدالماجد دریابادی کے الحاد کا یہ دور 1908-18 تک کل دس برس تک قائم رہا۔ دین کی طرف پلٹ آنے کے بعد انھوں نے مولانا اشرف علی تھانوی جیسے بزرگ حضرات کی صحبت اختیار کی، اسلامی علوم

قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ، علم کلام اور عربی میں دستگاہ پیدا کی اور پختہ مطالعہ کر کے دین حق کی حقانیت کے قائل ہوئے۔ جس شدت سے اسلام سے دور ہوئے تھے اب اسی متشددانہ طور پر اپنی اصلاح کے درپے ہوئے اور پوری زندگی بدل ڈالی۔ کہاں دن چڑھے سونے کا معمول تھا کہاں سردی کی راتوں میں منہ اندھیرے اٹھ کر وضو کرنا مسجد جا کر فجر کی نماز ادا کرنا۔ دور الحاد میں تو فکر نہ تھی، اسلام کے بعد انھوں نے اپنی اہلیہ سے نذر و نیاز، فاتحہ، منتیں، درگاہ، اور مزاروں پر جانے کی عادتیں چھڑوائیں اور اسلام پر صحیح معنوں میں عمل پیرا ہو کر سارے خاندان کو بھی اسی رنگ میں رنگ دیا۔ مہر جو لاکھوں میں تھا اور جس کی ادائیگی کی اپنے دور الحاد کے باعث انھیں کوئی فکر نہ تھی اپنے اسلام کے بعد اسے معاف کرایا۔ 1929 میں حج کیا۔

اس دوران معاشی جدوجہد جاری رہی۔ متعدد جگہوں پر بطور ٹیچر، پروفیسر یا افسر کے درخواست دی لیکن کسی نہ کسی وجہ سے امیدیں بر نہیں آئیں۔ رسالہ ادیب (الہ باد)، الناظر (لکھنؤ)، کے لیے معاوضے پر مضامین لکھتے رہے۔ علامہ شبلی نے سیرت النبی لکھنے کے لیے انگریزی کتابوں کے ترجمے کے لیے اپنے ساتھ بطور معاون بھی رکھا، انجمن ترقی اردو کی طرف سے ترجمے کے مختلف کام اسائنمنٹ ملتے رہتے تھے۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے لٹریری اسسٹنٹ کے طور پر بھی انھوں نے خدمات انجام دیں۔ ستمبر 1917 میں حیدرآباد کے سررشتہ تالیف و ترجمہ میں بطور مترجم فلسفہ و منطق ان کا تقرر ہوا۔ لیکن یہاں ان کی کتاب فلسفۂ اجتماع کی اشاعت پر دینی حلقوں کی طرف سے ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور آپ کو سال بھر کے اندر ہی اپنی نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ رسالہ معارف میں بھی آپ باقاعدگی سے مضمون لکھتے رہے۔ اس کے معاون مدیر کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ لیکن عبدالماجد آزاد منش طبیعت کے آدمی تھے، نوکری کی مشقتیں اور پابندیاں ان کے طبع نازک کو گوارا نہ تھیں۔ 1919 سے نظام حیدرآباد کی طرف سے آپ کو باقاعدہ سرکاری وظیفہ ملنے لگا اور یوں آپ ملازمت سے بے نیاز ہو گئے۔

1922 سے لکھنؤ چھوڑ کر مستقل طور پر دریاباد میں قیام پذیر ہو گئے اور مستقبل کے سارے صحافتی و علمی کارنامے اسی قصبے سے انجام دیے۔ سیاست سے دلچسپی نہیں رہی، مگر 1925 میں مولانا محمد علی جوہر کی تجویز پر انھیں اودھ خلافت کمیٹی کا صدر بنایا گیا۔

کہتا ہوں 'سچ': 1925 میں دوستوں کے تعاون سے ہفتہ وار سچ شروع کیا۔ اگست

1925 سے باقاعدہ اس کے ایڈیٹر ہو گئے۔ ان کا ادارتی کالم سچی باتیں ایک عالم میں مقبول ہوا۔ سچ، مغربی تہذیب وتمدن کے خلاف ایک شمشیر برہنہ تھا۔ رواجی تصوف، تعزیہ داری و دیگر بدعات کے خلاف اس نے بیداری پیدا کرنے میں ایک اہم رول ادا کیا۔ نیاز فتح پوری اور دیگر تجدد پسند ومغرب سے مرعوب مسلمان جو اسلام کے بنیادی عقائد میں رد و بدل کے درپے تھے، جن کی گستاخی کی زد توحید، رسالت، آخرت، ملائکہ وغیرہ پر پڑتی تھی؛ ان سے معرکہ آرائی میں سچ نے ایک مثال قائم کی اور جن جن عقائد و افکار کو یہ طبقہ فرسودہ بتاتا تھا انھیں منطقی دلائل کی روشنی میں عین تقاضائے عقل وفطرت ثابت کردکھایا۔

1933 میں آپ نے اپنی انگریزی تفسیر پر کام شروع کیا۔ بہت جلد آپ کو یہ احساس ہو گیا کہ تفسیر کا یہ کام مکمل یکسوئی چاہتا ہے چنانچہ آپ نے ہفتہ وار سچ کو عارضی طور پر بند کردیا۔ جب انگریزی تفسیر لکھنے سے فارغ ہو گئے تو مئی 1935 سے ہفتہ وار صدق کا اجرا فرمایا۔ اس رسالے کے ذریعے بھی سچائی کے اعلان کا فریضہ ادا کیا۔ چنانچہ تقسیم کے سانحے کے بعد کسی قسم کی معذرت خواہی کے بغیر آپ نے صاف صاف کہا کہ مسلمانانِ ہند نے سیکولرزم کو بطور ایک سیاسی حکمت عملی کے قبول کیا ھے اور یہاں کے آئین و دستور کی مشروط اطاعت اس وقت تک کرتے رھیں گے جب تک اس کا تصادم کتاب و سنت اور شریعت اسلامی سے نہ ھو۔ احتیاط کا یہ عالم تھا کہ آپ بجز سفرحج اور دینی کتابوں کے دیگر اشتہارات کو سرے سے قبول ہی نہیں کرتے تھے۔ صحافت ان کے نزدیک تجارت نہیں عبادت تھی۔ وہ ولایتی رسالے اور کتابوں کا مطالعہ خوب کرتے تھے کہ شیطان شناسی میں کوئی کمی نہ ہو۔ آخرانتظامی دشواریوں کی وجہ سے صدق کو بند کرنا پڑا۔ لیکن صحافت بطور عبادت اب عبدالماجد دریابادی کی زندگی کا اک جزو لاینفک بن چکی تھی چنانچہ آپ نے دسمبر 1950 سے صدق جدید نکالنا شروع کیا۔ نام بدل گیا لیکن اصول اور لب ولہجہ نہیں بدلا۔ آپ کی فلسفہ اور مغربی تہذیب کے اصول ومبادی پر گہری نظر تھی چنانچہ اشتراکیت، سیکولرزم، جمہوریت، الحاد، بے دینی، فحاشی وغیرہ کے خلاف متعدد علمی تحریریں بھی منظرِ عام پر آئیں۔ گو اپنے مخصوص انداز میں وہ ایک فلسفیانہ بات کو بھی اس ڈھنگ سے پیش کرتے تھے کہ ایک عام آدمی کی سمجھ میں ساری باتیں آجاتی تھیں۔ عبدالماجد کے قلم کا جادو اسی لیے لوگوں کے سر چڑھ کر بولتا تھا۔ ہندوستان و پاکستان کے علاوہ صدق جدید کے خریدار عراق، حجاز، مصر، لیبیا، کویت، سری لنکا، برما، افریقہ وغیرہ میں کثیر تعداد میں تھے؛ علاوہ

ازیں برطانیہ، فرانس، کینیڈا اور امریکہ میں بھی یہ رسالہ منگایا جاتا تھا۔ آپ ایک ناقد اور مبصر کی حیثیت سے مقبول رہے لیکن اس میں بھی سستی شہرت کے لیے کبھی اپنے اصولوں کا سودا نہیں کیا، جب بھی تنقید کی، جس پر بھی کی، اصولی کی؛ ذاتیات پر کیچڑ اچھالنا ان کا شیوہ نہ تھا۔ آپ کی ریڈیائی تقریریں بھی، جو اکثر آپ کے رسالے کے صفحات کی زینت بنا کرتی تھیں، بڑے شوق سے پڑھی جاتی تھیں۔

سراپا قلم: آپ کو اردو، انگریزی، عربی، فارسی پر عبور حاصل تھا۔ اوائل عمر سے اخیر تک آپ اپنے قلب وضمیر کی آواز کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کرتے رہے۔ آپ کے تصنیفی کارناموں کی صرف اگر فہرست ہی تیار کی جائے تو وہ اس کی ضخامت پر ایک باقاعدہ تصنیف کا شبہہ ہوگا۔ ابھی آپ تعلیم سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ آپ کے مضامین لکھنؤ کے الناظر، العصر، الندوہ، ہمدم، صبح امید اور معلومات جیسے معیاری پرچوں میں نکلنے لگے تھے۔ ادیب (الہ آباد) میں بھی پابندی سے لکھتے تھے، ریاض الاخبار، البشیر (اٹاوہ)، وکیل، ہندوستانی، آجکل، نقوش اور مسلم یونیورسٹی میگزین میں بھی کثرت سے لکھا۔ **حقیقت** کی ادارت ونگرانی بھی کی۔

قلم کو جو سبک رفتاری اردو مضمون نگاری میں حاصل تھی وہی درجہ انگریزی میں بھی حاصل تھا چنانچہ دور طالب علمی میں ہی آپ کی انگریزی نگارشات سہ روزہ ایڈوکیٹ (لکھنؤ)، مسلم ہیرالڈ (الہ آباد)، روزنامہ لیڈر (الہ آباد)، بمبئی کرانیکل (بمبئی)، ماہنامہ ویدک میگزین (دہرہ دون)، انڈین ریویو (مدراس)، تھیاسوفسٹ (مدراس)، ہفتہ وار کامن ویل (مدراس) اور ماڈرن ریویو (کلکتہ) وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی تھیں۔ بعد ازاں مصروفیات کی وجہ سے انگریزی میں باقاعدہ لکھنا کم ہوگیا لیکن ترک نہیں ہوا؛ متعدد مراسلے **پانیر، لیڈر** اور **اسٹیٹسمین** میں نکلے، **نیشنل ہیرالڈ** میں اردو کی حمایت میں ایک مضمون لکھا۔ **مسلم ریویو** (لکھنؤ)، **وائس آف اسلام** (کراچی) وغیرہ میں بھی مضامین آئے۔

قلم سے ان کا رشتہ طالب علمی کے دور کے بعد بھی قائم رہا چنانچہ **معارف** میں ان کے بہت سارے مضامین، نوٹس، تبصرے وغیرہ اس کے شاہد ہیں۔ 1919 سے معارف میں ان کے لیے باقاعدہ صفحات متعین ہوگئے۔ مدیر سید سلیمان ندوی کی غیر حاضری میں 1922 میں کچھ مدت اس پرچے کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالی۔ 1950 سے معارف کی مجلس ادارت کے صدر تھے۔ مئی

1928 سے اپریل 1929 تک محمد علی جوہر کے پرچے **ھمدرد** کی نگرانی وادارت کا کام انجام دیا۔
یہ تو صحافت کی داستان ہوئی، تصنیفات پر نظر ڈالی جائے تو تنوع اور مضامین کی رنگارنگی اور اندازِ بیان کی دلکشی میں لاجواب معلوم پڑتی ہیں۔
اردو اور انگریزی میں ان کی تفسیر بیسویں صدی کے تفسیری لٹریچر میں ایک اہم مقام رکھتی ہیں۔ تفسیر ماجدی وسعت مطالعہ، انداز بیان، دقت نظر اور قرآن فہمی کے حساب سے ایک شاہکار ہے۔ انگریزی ترجمہ وتفسیر کا کام شروع کرتے وقت ان کے پیشِ نظر ایک ایسی تفسیر کی تیاری تھی، جو الحاد کی وادیوں میں بھٹکنے والے انگریزی داں طبقے تک عام فہم زبان میں قرآن کا پیغام پہنچا سکے۔ اردو کی تفسیر کو آپ نے ذرا تفصیل سے لکھا اور اس میں اسرائیلی روایات اور یہود ونصاریٰ کے دجل وفریب کا پردہ چاک کیا، انبیاء کی صحیح سیرت پیش کی، تفسیر کرتے وقت موجودہ سائنسی علوم اور اپروچ کا خیال رکھا۔
آپ نے متعدد کتابوں کے ترجمے کیے، ان میں تاریخ تمدن، تاریخ اخلاق یورپ، مکالمات برکلے، پیام امن وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔ بچپن سے ہی آپ کو سفر کا شوق تھا، بڑے ہو کر سفر کا خوب ہی موقع ملا، ان اسفار میں اپنے تجربات اور غور وفکر کے سامان سے انھوں نے جو نتائج اخذ کیے اسے آئندہ آنے والی نسلوں کے لیے ایک سرمائے کی صورت میں محفوظ کر دیا چنانچہ ان کے متعدد سفرنامے شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں جن میں، سفرِ حجاز، ڈھائی ہفتہ پاکستان میں، تاثرات دکن اور اسفارِ ماجدی وغیرہ شامل ہیں۔ سوانحی لٹریچر میں بھی آپ قیمتی اضافوں کا سبب بنے ہیں۔ آپ بیتی، محمد علی کی ذاتی ڈائری کے چند اوراق، حکیم الامت: نقوش وتاثرات، معاصرین ووفیاتِ ماجدی قابلِ ذکر ہیں۔
مختلف اوقات میں ریڈیو پر جو تقاریر آپ نے کی تھیں ان کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ جنوری 1958 کو مدراس کا سفر کیا وہاں قرآن میں سیرت نبوی کے عنوان پر لیکچر دیے جو بعد ازاں سیرت نبوئ قرآنی کے عنوان سے شائع ہوئے۔ قرآنی موضوعات پر کئی کتابیں لکھیں مثلاً ارض القرآن، اعلام القرآن، حیوانات القرآن، مشکلات القرآن وغیرہ۔ فلسفہ پر بھی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔ علاوہ ازیں مکتوبات، تبصرات، مقالات اور غزلیات کے بھی متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔
مضمون پھر چاہے قرآن پر ہو یا فلسفہ پر یا پھر سادہ وعظ ونصیحت، موضوع پر عبدالماجد دریابادی کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑتی۔ آپ کا زوردار اندازِ بیان اور جوشِ غضب قاری کو اپنے ساتھ بہالے

جاتا ہے۔آپ کی تحریروں میں بے پناہ روانی پائی جاتی ہے۔طرزِ انشالاجواب ہے اس پر دلآویز سرخیاں اور واقعات کی مصوری مستزاد، سچ ہے کہ مدیرِ سچ کا تحریری اسلوب نرالا ہے اور اپنے اندر ایک اجتہادی شان رکھتا ہے۔

احوالِ دیگر: عبدالماجد دریابادی متعدد داعیوں کے باوجود پاکستان نہیں گئے، ہندوستان میں جمے رہے مگر غیرِ مشروط وفاداری وطن کے ساتھ نہیں، اپنے مذہب کے ساتھ رکھی اور ببانگِ دہل اس کا اعلان کرتے رہے۔1955 اور 1958 میں پاکستان کا سفر کیا۔ پہلا سفر ذاتی تھا جس کی روداد چھپ چکی ہے، دوسرا سفر اسلامی مذاکرہ لاہور میں ہندوستانی وفد کے صدر کی حیثیت سے کیا۔ پاکستان کی حکومت کی جانب سے شرعی حدود کے نفاذ کے سلسلے میں ایک سوالنامہ آپ کی خدمت میں بھیجا گیا، اس کا مفصل جواب دیا۔

آپ کی صلاحیتوں کی قدر کرتے ہوئے آپ کو متعدد سرکاری وملی مجلسوں وکمیٹیوں کا حصہ بنایا گیا۔ 1916 سے آپ **دار المصنفین** کے بنیادی رکن رہے اور اخیر عمر تک اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر رہے۔اس کے علاوہ **ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد** کے ممبر بھی رہے۔**ندوۃ العلماء** کی مجلس انتظامیہ کے رکن اخیر تک رہے، ندوہ کے متعدد اجلاس کی صدارت بھی کی، ندوہ میں **مجلس تحقیق و نشریات اسلام** کے قیام میں اہم رول ادا کیا۔اسی طرح یوپی اردو اکیڈمی کی کونسل وانتظامیہ؛ ریڈیو ایڈوائزری کمیٹی کے شعبۂ اردو؛ کرپلانی کمیٹی اور یوپی حج کمیٹی کے ممبر بھی رہے۔اس کے علاوہ متعدد یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی کے مقالے کے ممتحن کی خدمات بھی انجام دیں۔

اپریل 1967 میں صدر رادھا کرشنن نے آپ کو عربی میں سند فضیلت عطا کی، اسی سال یوپی حکومت نے انھیں بہترین اردو مصنف کے ایوارڈ سے نوازا۔ مارچ 1976 میں علی گڑھ یونیورسٹی نے اعزازی ڈاکٹر آف لٹریچر کی ڈگری سے نوازا۔

آخری دور میں صحت خاصی متاثر رہنے لگی تھی، مارچ 1974 اور پھر دسمبر 1976 کو آپ پر فالج کا حملہ بھی ہوا۔ 4 جنوری 1977 کو انتقال فرمایا۔ اللہ تعالیٰ قلمی جہاد کرنے والے اس بلند پایہ مدیر، صحافی ومصنف کو اپنے دامانِ رحمت میں جگہ دے اور اس کی چھوڑی ہوئی تحریری متاع سے آنے والی نسلوں کو کماحقہ استفادے کی توفیق نصیب فرمائے۔ آمین!